© rasailojaraid.com



قاضی زین العابدین سجاد

# ہندوستان کے عربی مدارس

# اور

# اُن کے نصابِ تعلیم پر ایک نظر

ہندوستان میں حکومتِ مغلیہ کے عہدِ رواں تک، اسلامی مدارس میں جو نصابِ تعلیم جاری تھا وہ اپنے زمانے کی دینی و دنیوی دونوں قسم کی ضرورتوں تک تکمیل کرتا تھا۔ یہ نصابِ تعلیم خالص دینی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے متعلقات، اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث، اصولِ فقہ، علم الکلام اور ان کے مبادی صرف ونحو و معانی و ادب وغیرہ کے علاوہ رائج الوقت دنیوی علوم ریاضی، منطق، فلسفہ، ہیئت وغیرہ پر بھی حاوی ہوتا تھا۔ چنانچہ ان مدارس کے فضلاء اپنے اپنے ذوق کے مطابق دینی و دنیوی خدمت کی راہوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کر لیتے تھے۔ وہ مسندِ دعوت وارشاد پر بھی فائز ہوتے تھے اور کرسی حکومت کی زینت بھی بن جاتے تھے۔

آغازِ دورِ حکومتِ انگریزی تک یہی صورت قائم رہی۔ انیسویں صدی کے نصف تک آپ بے شمار علماءِ کرام صدر الصدور، مفتی، قاضی اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدوں پر مامور پائیں گے۔ مولانا فضل امام خیرآبادی (صدر الصدور) مولانا فضل حق خیرآبادیؒ (سررشتہ دار ریزیڈنسی دہلی) مفتی صدر الدینؒ (صدر الصدور) مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (ڈپٹی انسپکٹر مدارس) وغیرہ سب انہی مدارس کے فارغ التحصیل علماء تھے۔

انگریزوں کے ابتدائی عہد میں بھی حکومتی زبان فارسی ہی رہی۔ اس کے بعد سرکاری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دفتری زبان انگریزی ہوگئی۔ تاہم علماءِ کرام اپنے مناصب پر قائم رہے۔ تقریباً ۱۸۳۰ء تک ہندوستان میں قدیم نظامِ قضاء جاری رہا۔ قاضیوں کے اختیارات میں (جو وقت کے علماء ہوتے تھے) دیوانی مقدمات کی سماعت شامل تھی۔ مگر اس کے بعد قاضی کا عہدہ ختم کر کے منصف کا عہدہ جاری کیا گیا اور مصلحتِ وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام برسرِ عہدہ قضاۃ کو منصف بنا دیا گیا۔ میرے جدِ امجد مولوی قادر بخش قاضی میرٹھ ان قضاۃ میں شامل تھے جن کو منصف بنایا گیا تھا۔ مگر کچھ وقت گزرنے پر آہستہ آہستہ غیر مسلم جنھوں نے حکومتِ وقت کی زبان اور رائج الوقت علومِ جدیدہ سیکھنے میں سبقت کی تھی، انگریزی حکومت کے عہدوں پر چھا گئے۔

## قدیم و جدید تعلیم گاہوں کی تقسیم:

سرکاری زبان انگریزی قرار پانے کے بعد انیسویں صدی کے آغاز میں جگہ جگہ انگریزی اسکول اور کالج کھولے گئے اور ان میں انگریزی اور علومِ جدیدہ کی تعلیم دی جانے لگی اور انیسویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے نہ صرف انگریزی زبان ملک کی دفتری زبان بن گئی بلکہ جدید مغربی علوم ہندوستان کے دماغوں پر چھا گئے اور قدیم علومِ عقلیہ تقویم پارینہ بن گئے۔

ہندوستان میں انگریزی دَور میں جو نظامِ تعلیم جاری کیا گیا اس کا اوّلین مقصد سرکاری دفتروں کے لیے سستے اہلکار مہیا کرنا تھا اور مشن اسکولوں اور کالجوں کا (جن کا جال پورے ہندوستان میں پھیلایا گیا تھا اور جسے حکامِ انگریزی کی پوری سرپرستی حاصل تھی) تو یہ بھی مقصد تھا کہ آہستہ آہستہ ہندوستانیوں کو عیسائیت کے آغوش میں دے دیا جائے۔ اسی لیے ان میں انجیل کی تعلیم لازمی مضمون کی حیثیت رکھتی تھی۔

گارساں دتاسی نے اپنے مشہور خطبات میں جابجا عیسائی مشنریوں، عیسائی حکام اور مشن اور سرکاری اسکولوں کی تبلیغی خدمات کا بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ چنانچہ خطبہ بستم میں لکھتا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



''اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف مشن اسکولوں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں۔ مسلمانوں کو خاص کر اس بات کا احساس ہے اور وہ اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام کے علاوہ نجات کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ لیکن ہندو لوگ اس باب میں زیادہ سخت نہیں۔ چنانچہ انہی کی جماعت کے افراد مسیحی تبلیغ سے متاثر ہو رہے ہیں۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنری بھی غافل نہیں ہیں۔ وہ بھی اپنا کام انہاک سے کیے جاتے ہیں اور اپنی مساعی کا پھل پاتے ہیں۔''

[ترجمہ خطباتِ گارساں دتاسی، ص ۸۰۲، مطبوعہ اورنگ آباد]

ہندوستان کے بالغ نظر علماءِ کرام نے جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کی شاطرانہ چالوں کو گہری نظر سے دیکھتے رہے تھے اور جن کے مقتدا حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے انگریزی دَورِ حکومت کے آغاز میں ہی اس کے مقبوضہ علاقوں کو ''دارالحرب'' قرار دے دیا تھا۔ پھر ان کے خلفاء اور جانشینوں (حضرت مولانا سیّد احمد شہیدؒ، حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ وغیرہم نے ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحد پر اور حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مدنی، حضرت حافظ ضامن شہید، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہم نے ۱۸۵۷ء میں دہلی اور اطرافِ دہلی میں علمِ جہاد بلند کیا تھا، اس نظامِ تعلیم کو مسترد کر دیا اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں دینی تعلیم کے آزاد مدارس جاری کرائے۔ وہ ان مدارس کو حکومت کے اثرات سے اس درجہ بے تعلق رکھنا چاہتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے، جو وصیت نامہ، دارالعلوم دیوبند کے لیے مرتب فرمایا اس میں صاف تصریح فرمادی کہ ''مدرسے کے چندے میں حکومت اور امراء [illegible] کی شرکت [illegible] معلوم ہوتی ہے [illegible] ہدایت فرمادی کہ ''کارکنانِ مدرسہ کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مدار توکل پر ہونا چاہیے۔ کسی جاگیر یا کارخانۂ تجارت کا بندوبست نہ کیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں اتفاق باقی نہ رہے گا۔'' [''دارالعلوم دیوبند''، مرتبہ مولانا محمد طیب صاحب، ص ۱۸]

علماءِ کرام کے اس اقدام سے یہ بہت بڑا فائدہ ہوا کہ... مسلمانوں میں دینی علوم کا چرچا باقی رہا اور ہندوستان کے چپے چپے میں بڑے چھوٹے دینی مدرسوں کا ایک جال بچھ گیا۔ لاکھوں مسلمان بچے جو انگریزی اسکولوں میں پڑھنے کی وسعت نہ رکھتے تھے، ان مدارس میں دینی تعلیم حاصل کر کے جہالت کی تاریکی سے علم کی روشنی میں آ گئے۔ نیز ان مدارس کی اصلاحی و تبلیغی سرگرمیوں کے طفیل... ناخواندہ اور کم خواندہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہو گئے۔ مگر اس انگریز بیزاری اور انگریزی سے نفرت کا ایک نقصان یہ ہوا کہ ہمارے قدیم مدارس میں وقت کے جدید علوم بار نہ پا سکے۔ فلسفۂ جدید، معاشیات، علمِ تمدن، سائنس حتیٰ کہ تاریخ سے بھی علماءِ کرام کی ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہونے والی نسل عموماً بے بہرہ رہ گئی۔ اس کا زیادہ نقصان رساں پہلو یہ ہے کہ انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کی جو نئی نسل پھلی پھولی، اس کے دماغ کا سانچہ چونکہ ان کے سانچے سے مختلف تھا، اس لیے وہ ان کے دماغوں کے کانٹے نہ نکال سکے اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں اور قدیم علماء کے درمیان ایک علمی و فکری خلیج حائل ہو گئی۔ اس طرح تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں بھی ان کا دائرۂ عمل محدود ہو کر رہ گیا۔

## علومِ جدیدہ کی ضرورت کا احساس:

اس کمی کو انیسویں صدی کے آخر میں سختی کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ چنانچہ ندوۃ العلماء کی تحریک اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ ندوۃ العلماء کے تخیل کو عملی شکل دینے کے لیے مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تحریک پر ۱۸۹۲ء (۱۳۱۰ھ) میں مدرسہ فیض عام کان پور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر جو مشاہیر علماءِ ہند جمع ہوئے ان میں سرفہرست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری اور ان کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا محمد حسین الٰہ آبادی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہم کے نام ملتے ہیں [سیرۃ مولانا محمد علی مونگیری، ص ۱۶] بعد میں غالباً حکومت رس اصحاب کے اس میں دخیل ہو جانے کی وجہ سے یہ بزرگ اس تحریک سے علیحدہ ہو گئے۔ (جیسا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عمارت کے سنگِ بنیاد والے معاملے سے اندازہ ہوتا ہے) تاہم عربی و دینی مدارس میں، علومِ جدیدہ کو نصابِ تعلیم میں داخل کرنے اور علومِ جدیدہ اور انگریزی کے ماہرین کو علومِ دینیہ سے واقف کرنے کی ضرورت تسلیم کی جانے لگی۔ چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ۱۳۳۰ھ میں، اپنی انجمن موتمر الانصار کے ''قواعد و مقاصد'' میں اس ضرورت کی تکمیل کے لیے عملی تجاویز پیش کیں اور بعد میں ان پر کچھ عمل بھی ہوا۔

## علماءِ دیوبند اور علومِ جدیدہ:

یہاں ایک مسئلے کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ علماءِ دیوبند نے انگریزی اور علومِ جدیدہ کی مخالفت کی۔ مگر تعجب ہے کہ متقدمین علماءِ دیوبند میں بیشتر بزرگ خود ان علوم سے آراستہ نظر آتے ہیں۔ علماءِ دیوبند کے سرِخیل اور استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی نانوتوی (م ۱۸۵۱ء) تھے جن کے چشمۂ فیض سے، مولانا محمد قاسم نانوتوی سرپرستِ اوّل دارالعلوم دیوبند (م ۱۲۹۷ھ)، مولانا رشید احمد گنگوہی سرپرستِ دوم دارالعلوم دیوبند (م ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (م ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۴ء)، والدِ ماجد بزرگوار مفتی عزیز الرحمان دیوبندی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر المدرسین اوّل دارالعلوم دیوبند (۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء)، مولانا محمد مظہر نانوتوی صدر المدرسین اوّل مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور (۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء) جیسے اکابرِ علماءِ دیوبند سیراب ہوئے۔ مولانا مملوک علیؒ ۱۸۲۵ء سے ۱۸۵۱ء تک دہلی کالج کے استاذ رہے اور آخر کے دس سال (مولانا رشید الدینؒ کے انتقال کے بعد) کالج کے شعبۂ علومِ شرقیہ کے صدر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ آپ کے متعلق مولوی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کریم الدین پانی پتی لکھتے ہیں:

''بناء مدرسہ عربی (کالج کا شعبۂ عربی و دینیات) ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی اُردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں۔ ہر ایک علم وفن سے جو ان زبانوں میں ہیں، مہارتِ تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اُردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے، اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے۔ گویا اس فن کو اوّل ہی سے جانتے تھے۔''

[تذکرۂ طبقات الشعراء، ص ۴۶۳]

مولانا کے ایک شاگرد اور عزیز مولانا محمد احسن نانوتوی تھے جن کے برادرِ خورد مولانا محمد منیرؒ ۱۳۱۱ھ و ۱۳۱۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ مولانا محمد احسن نے بھی دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی اور پھر بریلی کالج میں عربی کے پروفیسر رہے۔ موصوف کے فضل وکمال کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آپ نے احیاء العلوم (امام غزالی) جیسی ضخیم کتاب کا ترجمہ مذاق العارفین کے نام سے کیا۔ اور کنز الدقائق کا احسن المسائل کے نام سے، اور حصن حصین کا خیر متین کے نام سے کیا۔ نیز درمختار کے مشرح ترجمے غایۃ الاوطار کی تکمیل کی۔ آپ کی ایک اچھی سوانح حیات حال میں مولوی محمد ایوب قادری ایم۔اے نے کراچی سے شائع کی ہے، اس میں مولانا کی ایک نجی ڈائری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس میں مولانا کے قلم سے انگریزی کی تحریرات بھی موجود ہیں۔''

نیز یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ مولانا محمد احسنؒ نے، سرسیّد احمد خاں مرحوم کی فرمائش پر گاڈ فرے ہگنس کی کتاب Apology کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا تھا اور یہ کتاب علی گڑھ کی لٹن لائبریری میں محفوظ ہے۔ مولانا نے ۱۸۹۴ء میں دیوبند میں انتقال فرمایا۔ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ [مولانا محمد احسن، ص ۱۴۱]

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم کے بانیوں میں شامل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تھے۔ آپ نے بھی مولانا مملوک علیؒ سے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ کے متعلق گارساں دتاسی لکھتا ہے:

''وہ دہلی کالج کے طالب علم تھے۔ چند سال کے لیے بریلی کالج میں پروفیسر ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء میں وہ میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ مسٹر ٹیلر ان سے واقف تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مولانا ذوالفقار علی ذہین اور طباع ہونے کے علاوہ علومِ مغربی سے بھی واقف تھے۔ ان کے (عربی اور اُردو) کلام سے قطع نظر، اُنھوں نے اُردو میں تسہیل الحساب کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو بریلی سے ۱۸۵۲ء میں چھپی ہے، اس کو Tate's Postolozzian Arithmetic, by H.S. Raid کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔''

[مولانا محمد احسن، ص ۲۶، بحوالہ ہسٹری آف لٹریچر، ص ۴۶۱، ج ۱]

ان کے علاوہ مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی جو سہارن پور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ایک تھے اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جو دارالعلوم کی صدارت سے پہلے اجمیر کالج کے پروفیسر اور سہارن پور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے اور مولانا محمد منیر صاحب جو دارالعلوم کے اہتمام سے پہلے بریلی کالج میں پروفیسر تھے اور مولانا محمد مظہر صاحب جو مظاہر العلوم کی صدارت تدریس سے پہلے آگرہ کالج میں پروفیسر تھے، ان بزرگوں کے متعلق بھی (اعلیٰ انگریزی تعلیم گاہوں اور سرکاری تعلیمی مناصب سے متعلق ہونے اور بہترین ذہانت اور علمی ذوق کے مالک ہونے کی بنا پر، کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی اور علومِ جدیدہ سے ناواقف نہ ہوں گے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ سرپرستِ اول دارالعلوم دیوبند کے متعلق ایک روایت ہے کہ آپ نے اپنے آخری سفرِ حج میں کپتان جہاز کو تبلیغ اسلام کے سلسلے میں انگریزی زبان کی ضرورت کو محسوس کیا اور انگریزی پڑھنے کا ارادہ بھی فرمالیا مگر پیامِ اجل نے مہلت نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دی۔ اسی طرح مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ:

''اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی ہی اچھی جو کام تو آتی ہے۔'' [تذکرۃ الرشید]

بہرحال علماءِ دیوبند کی علومِ جدیدہ اور انگریزی کی مخالفت کا جو عام چرچا ہے اکابر علماءِ دیوبند کا دامن تو اس سے بری ہے۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے معرکۂ آزادی کے بعد انگریزوں سے جو نفرت پیدا ہوئی اور پھر سرسیّد احمد خاں مرحوم نے تہذیب الاخلاق اور اپنی تفسیر کے ذریعے جن دینی افکار کا اظہار کیا۔ اس کے بعد میں علماءِ کرام کو علی گڑھ کالج اور اس کے کارپردازوں سے، جو ہندوستان میں تعلیمِ جدیدہ کے رہنما تھے، بعید کر دیا۔

مگر بیسویں صدی کے آغاز میں جب ہندوستان میں قومی تحریکوں کا چرچا ہوا اور کانگریس جمعیۃ علمائے ہند اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارموں پر قدامت پسند علماء اور جدید تعلیم یافتہ زعماء ایک دوسرے سے ملے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا ظفر علی خاں وغیرہم بار بار دیوبند تشریف لائے تو یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے اور محسوس کیا کہ عظیم دینی و ملّی مقاصد کی تکمیل کے لیے دونوں طبقوں کا اشتراکِ عمل بیحد ضروری ہے۔ ضمناً انگریزی اور علومِ جدیدہ کی تعلیم گاہوں کے افادی پہلو بھی علماءِ کرام کے سامنے آئے اور اُنھوں نے ان کے مسائل سے عملی دلچسپی لینی شروع کر دی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ تعالیٰ باوجود شدتِ ضعف کے علی گڑھ تشریف لے گئے اور وہاں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا افتتاح فرمایا۔

## دارالعلوم دیوبند میں اصلاحِ نصاب:

۱۹۲۵ء کے لگ بھگ دارالعلوم دیوبند میں تبلیغی ضروریات کے لیے انگریزی اور سنسکرت کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ ماسٹر نصر اللہ خاں مراد آبادی انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ مدت نہ چل سکا۔ راقم الحروف اس زمانے میں دارالعلوم میں پڑھتا تھا۔

شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے آخری زمانے میں پھر نصاب پر نظرِ ثانی کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تحریک شروع ہوئی اور دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ نے باضابطہ ایک کمیٹی کی اس مقصد کے لیے تشکیل کی۔ اس کمیٹی نے نصاب میں ترمیمات کیں اور قدیم علومِ عقلیہ کو کم کر کے انگریزی اور علومِ جدیدہ کو اس میں شامل کرنے کی سفارش کی۔ مگر بعض وجوہ سے مولانا مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی زندگی میں اس کمیٹی کی سفارشات پر عمل نہ ہو سکا۔ تاہم اس کی ضرورت برابر محسوس کی جاتی رہی۔

گزشتہ چند سالوں میں مجلس شوریٰ میں اس مسئلے کو پھر قوت کے ساتھ اُٹھایا گیا اور رجب ۱۳۸۳ھ میں ایک سب کمیٹی نصاب کی ترمیم کرنے اور انگریزی اور علومِ جدیدہ کو نصاب میں شامل کر کے اسے جدید دینی وملی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے تشکیل کی گئی۔ اس کمیٹی کی متعدد نشستیں ہوئیں اور آخر طے کیا گیا کہ قدیم منطق اور فلسفہ کی کتابوں کو کم کر کے، ابتدائی سائنس، معلوماتِ عامہ اور تاریخ وجغرافیہ کو جزوِ نصاب بنایا جائے۔ نیز انگریزی کی تعلیم کا بھی اختیاری مضمون کی حیثیت سے انتظام کیا جائے۔ اس شعبہ کے لیے ڈگری کالج کے ایک ریٹائرڈ پرنسپل کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مگر افسوس کہ یہ شعبہ توقع کے مطابق مقبولیت حاصل نہ کر سکا اور اس کی راہ میں ابھی مشکلات حائل ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دارالعلوم کے ماحول میں ابھی اس کے لیے مناسب فضا پیدا نہ ہو سکی ہے اور بعض حلقوں میں ان علوم کو اجنبی سمجھا جا رہا ہے مگر اُمید ہے کہ جلد ہی یہ اجنبیت دُور ہو جائے گی اور اس کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کر لیا جائے گا۔

عربی جدید کی تقریری وتحریری قابلیت پیدا کرنے کے لیے بھی ایک شعبہ صف العربی کے نام سے قائم کیا گیا ہے جس کے استاذ اعلیٰ مولانا وحید الزماں کیرانوی مدیر دعوۃ الحق (عربی) ہیں۔ یہ شعبہ بہت کامیاب ثابت ہوا ہے اور طلبہ اس سے توقع سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں متعدد ایسے طلبہ تیار ہو گئے ہیں جو عربی تحریر وتقریر پر اچھی قدرت رکھتے ہیں۔

شعبۂ تعلیم انگریزی کو نصاب تعلیم سے الگ رکھا گیا ہے اور اس میں وہی طلبہ داخل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہوتے ہیں جو عربی نصاب کی تکمیل کر چکے ہوں۔ اس شعبے کا مقصد یہ ہے کہ فضلاءِ دیوبند، انگریزی پر عبور حاصل کر کے ان ملکوں میں تبلیغِ اسلام کی خدمات انجام دے سکیں، جہاں اُردو نہیں سمجھی جاتی۔ ابھی تک اس شعبے کی تکمیل کر کے کوئی جماعت نہیں نکلی۔ بہر حال دیکھنا یہ ہے کہ انگریزی سے فراغت کے بعد، اس شعبے کو طلبہ زندگی کا کون سا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ اگر یہ بھی دنیوی مقاصد کے لیے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لانے لگے تو مجلسِ شوریٰ کو غور کرنا پڑے گا کہ اس شعبے کو باقی رکھے یا اس کی متبادل کوئی دوسری صورت اختیار کرے۔ مثلاً یہ کہ فضلاءِ مدارسِ عربیہ کو انگریزی کی تعلیم دینے کے بجائے، انگریزی یونیورسٹیوں کے گریجویٹوں کو دارالعلوم دیوبند میں (حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تجویز کے مطابق) معقول وظیفہ دے کر، دینیات کا مخصوص نصاب پڑھایا جائے۔

## عام مدارس کی حالت:

اب میں عام مدارسِ عربیہ کے متعلق جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں، خصوصاً یوپی کے ہر قصبے اور شہر میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن پر ملّت کا بہر حال لاکھوں روپیہ صرف ہو رہا ہے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ان مدارس کی افادیت اور اہمیت سے بالکل انکار کرنا تو یقیناً ناانصافی ہوگی۔ اس لیے کہ ان کا کم از کم ایک فائدہ تو یہی ہے کہ غریب مسلمان، بچے جو اسکولوں کالجوں کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے، قرآنِ کریم پڑھ لیتے ہیں، بنیادی دینی تعلیمات سے واقف اور جہالت کے دائرہ سے نکل کر علم کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مگر ملّت کا جتنا روپیہ ان پر صرف ہوتا ہے اور ابناءِ ملّت کا جتنا وقت یہاں خرچ ہوتا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے، اس نتیجے کو ہرگز قابلِ اطمینان نہیں کہا جا سکتا۔

ان مدارس میں وہی قدیم نصابِ تعلیم جاری ہے جو دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارن پور کا ہے، قطع نظر اس امر کے کہ خود یہ نصاب وقت کی ضرورتوں کے مطابق تبدیلی چاہتا ہے، چھوٹے مدرسوں میں اب اس نصاب کو پڑھانے والے لائق اساتذہ بھی روز بروز مفقود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہوتے جا رہے ہیں۔ میں اپنے تجربے کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی ذی استعداد مدرس کسی مدرسے سے چلا جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرے کا میسر آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہر مدرسہ خواہ اس میں عربی کا ایک ہی مدرس ہو، میزان سے صحیح بخاری تک پڑھانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ بلکہ ان مدرسوں میں ابتدائی درجات کی تعلیم سے دورۂ حدیث کی تعلیم کو مقدم اور ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ عام رواج کے مطابق، سالانہ جلسہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب طلبہ کی ایک صف دستار بندی کے لیے اسٹیج پر موجود ہو۔

نتیجہ یہ ہے کہ اکثر حالات میں نہ طلبہ عربی زبان سے واقف ہوتے ہیں، نہ دینی مسائل سے، نہ قرآن کا ترجمہ کر سکتے ہیں، نہ حدیث کو سمجھ سکتے ہیں مگر ان کو ایک طویل و عریض سند حوالے کر دی جاتی ہے جسے بعض حالات میں وہ پڑھ کر بھی نہیں سُنا سکتے اور وہ بھی مرکزی دینی مدارس کے اکابر علماء کے دستِ مبارک سے۔

بعض مدارس میں ''عالم'' و ''فاضل'' (سرکاری بورڈ کے امتحانات) کے نصاب پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ نصاب اس قدر غیر متوازن ہیں کہ ان سے استعداد کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ پھر وہ طلبہ کے رُخ کو بھی دنیوی مقاصد کی طرف پھیر دیتے ہیں، حالانکہ اب اس مقصد کے لیے بھی یہ بیکار ہو چکے ہیں۔ پہلے انگریزی اسکولوں میں عربی و فارسی کی جگہیں مل جایا کرتی تھیں۔ اب عربی و فارسی کا کیا ذکر، اُردو ہی ان اسکولوں سے خارج کی جا چکی ہے۔ صرف اتنا فائدہ ہے کہ انگریزی کا ایک مضمون لے کر، بی اے کر سکتے ہیں مگر یہ صرف انگریزی کا بی اے Only in English ملازمتوں کے لیے بیکارِ محض ہوتا ہے۔ پھر یہ فائدہ تو معمولی ''جامعہ اُردو'' کے امتحانات پاس کر کے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اربابِ مدارس بھی اس نصاب کی لغویت کو سمجھتے ہیں مگر تھوڑی سی سرکاری امداد کے لیے اسے گوارا کر لیتے ہیں۔ بہر حال ضرورت ہے کہ ان مدرسوں کو مفید اور کارآمد بنایا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



## مولانا آزاد کی اصلاحی تجاویز:

اس سلسلے میں ایک اہم اقدام کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔قومی حکومت کے قیام کے بعد حکومت یوپی نے، سنسکرت مدرسوں کے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں مناسب تبدیلیاں لانے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔اسی کے ساتھ ساتھ ایک دوسری کمیٹی یوپی کے امدادی عربی و فارسی مدارس کے نصاب اور طریقۂ تعلیم کا جائزہ لینے اور انھیں وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانے کے لیے بھی مقرر کی گئی تھی۔یہ کمیٹی اگرچہ صوبائی نوعیت کی تھی مگر اس کے مقاصد کی اہمیت اور اس کی تجاویز کے دُور رس نتائج کے پیشِ نظر، مولانا مرحوم نے ۱۹۴۷ء میں ہی لکھنؤ میں مشاہیر علماء اور ماہرینِ تعلیم کی ایک کانفرنس منعقد کی۔

کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں آپ نے ان مدارس کے ماضی و حال پر فکر انگیز تبصرہ فرمایا اور اس سلسلے میں چند اصلاحی تجاویز پیش کیں۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی تجاویز کے اقتباسات یہاں پیش کردیے جائیں۔

(۱) سب سے پہلے مولانا مرحوم نے طریقۂ تعلیم کی تبدیلی پر زور دیا۔آپ نے فرمایا: ''قدماء علوم کے درس میں اور فنونِ آلیہ کے درس میں جو طریقے اختیار کرتے تھے، اسے املا کہتے ہیں۔عربوں نے علوم کی دو قسمیں کی ہیں آلات (فنونِ آلیہ) اور نفسِ علوم۔آلات وہ علوم جو بجائے خود علم نہیں ہیں بلکہ حصولِ علم کا ذریعہ اور آلہ ہیں جیسے گرامر وغیرہ اور نفسِ علوم جیسے فلسفہ و حدیث وغیرہ۔قدماء دونوں اقسامِ علوم کی تعلیم املاء کے ذریعے دیتے تھے۔اس زمانہ میں مدرس کا طریقۂ تدریس وہی تھا جو آج کل کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں پروفیسروں کا ہے۔یعنی طلبہ کے سامنے تقریر اور لیکچر کے ذریعے مطالبِ کتب کو سمجھاتا۔کتابوں میں جو کچھ ہوتا، اسے مدرس اپنے ذہن میں جمع کرلیتا اور اس دماغ سے مستعد ہوکر تدریس کے لیے آتا تھا۔یہاں وہ طلبہ کے سامنے تقریر کرتا اور تقریر میں مطالب سمجھاتا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



طلبہ نوٹ کر لیتے تھے اور نوٹوں کو کوئی ہوشیار طالب علم جمع کر لیتا تھا۔ یہ طریقہ ساتویں صدی تک رائج تھا۔ لیکن ساتویں صدی کے بعد ایک فرق نمایاں ہوتا ہے جب املا کا طریقہ بالکل مفقود ہو جاتا ہے اور املا کی جگہ کتابیں لے لیتی ہیں۔

میں کتابوں کا مخالف نہیں اور کتابوں کی مخالفت کون کر سکتا ہے؟ لیکن لکیر کا فقیر بن جانا تنزل کی واضح دلیل نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ بجائے اس کے پڑھنے والے کا دماغ علم و فن کی وادیوں میں آزادی سے سیر کر سکے اب کتابیں ہیں۔ پیروں میں زنجیر پڑ گئی اور خیالات محصور ہو کر رہ گئے—کتابوں کی کورانہ پابندی اور حد بندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بارہ بارہ چودہ چودہ برس تک سر کھپانے کے بعد صرف چند کتابوں کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ چند کتابوں کے علم اور نفسِ علم کے حصوں میں بڑا فرق ہے۔ مثال کے طور پر علمِ تفسیر کے درس میں بیضاوی اور جلالین کے قدم قدم پر احتیاجِ بیضاوی اور جلالین میں الجھ کر رہ جانے والے بہت ہیں۔ بیضاوی اور جلالین کا علم حاصل ہو گیا۔ مگر وہ عنقا جس کا نام علم التفسیر ہے، اس کی پرچھائیں بھی ان کے ذہنوں پر نہیں پڑی۔

اس کے بعد اصلاحِ نصابِ تعلیم کے سلسلے میں حسب ذیل تجاویز پیش کیں:

(۲) ہندوستان میں عربی علوم کی تعلیم جو شروع کی جائے تو اس کی پہلی رونمائی مادری زبان میں ہو۔ عروسِ علم کا گھونگھٹ جو کھلے تو وہ مادری زبان میں۔ اگر آپ فارسی بھی پڑھنا چاہتے ہوں تو ضرور پڑھیے لیکن فارسی کی تعلیم ایک علیحدہ چیز ہے۔ خلط مبحث کیوں کیجیے۔ اسی طرح متون و شروح کا معاملہ حدِ اعتدال سے گزر گیا ہے۔ اس کے بارے میں، میں پہلے بھی کافی کہہ چکا ہوں اور ہمیں اس طرف اصلاحی قدم اٹھانا چاہیے۔

(۳) یہی حال عربی علم و ادب کی تعلیم کا ہے۔ مختلف اسباب و وجوہ کی بنا پر اور ہماری بدقسمتی سے ہندوستان میں عربی علم و ادب کی تعلیم ہمیشہ کمزور رہی۔ اگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہندوستان کے صحیح عربی علم ادب کے جاننے والوں کا شمار کیا جائے تو ان کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور مجھے تو شک ہے کہ اس وقت بھی ایک ہاتھ کی سب انگلیاں گننی پڑیں گی۔

عربی ادب کی دو فنی شاخیں ہیں۔ فنِ بدیع اور فنِ کتابت۔ فنِ بدیع ایک طرح کی صنعت گری ہے۔ لفظی طلسمات کا ایک جنگل ہے۔ لیکن فنِ کتابت صحیح ادبی ڈھنگ اور طرزِ انشاء پر کسی چیز کے لکھنے کو کہتے ہیں--- آپ مجھے بتائیے کہ آپ نے فنِ کتابت کی کون سی کتابیں اپنے درس میں رکھی ہیں۔ ہم عربی تعلیم کے حصول پر چودہ پندرہ برس صرف کر دیتے ہیں اور ہم دس سطریں بھی ٹھکانے سے نہیں لکھ سکتے۔

(۴) ہم معقولات کی تعلیم میں ساری دُنیا سے ڈیڑھ سو برس پیچھے ہیں۔ مثلاً فلسفہ کی تعلیم کو لیجیے۔ موجودہ دور میں فلسفہ نے جو ترقی کی ہے اور نئے فلسفیانہ مباحث جو اس وقت مفکرین کے پیشِ نظر ہیں ان سے ہمارے معقولات نا آشنا ہیں۔ ہمارا فلسفہ یونانی فلسفہ کی آخری حد تک جا کے رُک جاتا ہے اور اس کے بعد خود ایک نیا راستہ اختیار کرتا ہے جسے فلسفہ کی تاریخ میں ایک درمیانی عہد سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس عہد کا فلسفہ یونانی فلسفہ کو موجودہ فلسفہ کے قریب کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عربوں نے اپنی فلسفیانہ جدوجہد میں جو یادگاریں چھوڑی ہیں وہ بے حد عظیم ہیں۔ اگر یہ کڑی نہ ہوتی تو شاید نئے دور میں جو اُٹھان ہوئی ہے، وہ اس شکل میں نہ ہو سکتی۔ اسے یورپ کے مستند عالم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس ورثے کو محفوظ رکھیں اور اس کی عظمت کو قائم رکھیں۔ لیکن عہدِ حاضر کا فلسفہ جو نئے مسائل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور تاریخ فلسفہ کی تعلیم از حد ضروری ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



## بعض دوسری تجاویز:

مولانا آزاد مرحوم کی ان تجاویز کی اہمیت وضرورت اب عام طور پر تسلیم کی جاچکی ہے۔ چنانچہ بعض عربی مدارس میں ان پر عمل بھی شروع ہو چکا ہے۔ اب میں بعض مزید تجاویز جن میں سے بیشتر کا تعلق انتظام سے ہے، پیش کرتا ہوں۔

(۵) ضرورت ہے کہ عربی مدارس کے نصابِ تعلیم کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ پہلے حصے میں قرآنِ کریم ناظرہ اُردو، ابتدائی دینیات اور سیرت پاک کے رسائل کے علاوہ پرائمری درجات کا رائج الوقت سرکاری کورس بھی پڑھایا جانا چاہیے تاکہ جو طلبہ ہائی اسکول میں جانا چاہیں وہ ان مدارس میں رہ کر اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہو جائیں۔ اس طرح یہ مدارس ان سرپرستوں کے لیے بھی جاذبِ توجہ بن جائیں گے جو اپنے بچوں کو دنیوی تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ دینی تربیت کا بھی اہتمام ہونا چاہیے ورنہ تعلیم کا مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ نصاب کے اس جزو کے بعد جس کی مدت پانچ سال ہوگی، ان طلبہ کے لیے جو دینی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، علومِ دینیہ (عربی) کا مختصر پنج سالہ نصاب جاری کیا جائے۔ جس میں صرف ونحو، ادبِ عربی اور منطق کے مختصر رسائل کے علاوہ، فقہ میں نور الایضاح، قدوری اور شرح وقایہ، اصولِ فقہ میں اصول الشاشی، علم الکلام میں الدین القیم (مولانا مناظر احسن) اور شرح عقائد نسفی یا رسالہ حمیدیہ، علم فرائض میں مفید الوارثین (میاں اصغر حسینؒ)، تفسیر میں قرآنِ کریم کا متن اور جلالین یا مدارک التنزیل۔ اصولِ تفسیر میں الفوز الکبیر اور حدیث میں موطا امام محمد اور صحاح کا کوئی منتخب مجموعہ اور اصولِ حدیث میں مقدمہ شیخ عبدالحقؒ دہلوی شامل ہوں۔ اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے مجوزہ تاریخ وجغرافیہ اور علومِ جدیدہ کے رسائل بھی شامل کر لیے جائیں تاکہ جو طلبہ ان مدارس سے فارغ ہو کر نکلیں وہ پانچ سال گزار کر بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



خالی داماں نہ نکلیں۔ اب تو ایسا ہوتا ہے کہ والدین اپنی اولاد کو بڑی دینی آرزوؤں کے ساتھ ان مدارس میں داخل کرتے ہیں مگر طلبہ وہاں کے کس مپرسانہ ماحول اور لامقصدیت سے گھبرا کر، چار پانچ سال ضائع کر کے نکل بھاگتے ہیں اور اپنے دامنِ دماغ کو یکسر خالی پاتے ہیں۔

اس کے بعد تعلیم کا تیسرا دور شروع ہو جس میں فقہ، کلام، معانی، تفسیر اور حدیث کی بقیہ کتابوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔ اس درجے کا انتظام صرف وہی مدارس کریں جو قابل اساتذہ بہم پہنچا سکتے ہوں۔ بلکہ بہتر ہو کہ عام مدارس دوسرے ہی درجے تک اپنی تعلیم ختم کر دیں اور تیسری منزل کو طے کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور، ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ جامعات میں بھیج دیں۔ تاکہ کام تقسیم ہو کر بہتر طریقے پر انجام پا سکے اور طلبہ ممتاز اساتذہ سے استفادہ کر سکیں۔

بہتر ہوتا اگر دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارن پور بھی اپنے نصاب کو اس قسم کے دو حصوں میں تقسیم کر دیں۔ پہلا درجہ عالمیت کا ہو اور دوسرا فضیلت کا۔ اس کے بعد دارالعلوم کا امتیازی درجہ تکمیل ہو۔

میں درجات کی اس تقسیم کو اپنے دماغ کی تراوش سمجھتا تھا، مگر اب اتفاقاً مولانا عبیداللہ مرحوم کی جمعیۃ الانصار کے قواعد و مقاصد مجوزہ ۱۳۳۰ھ نظر سے گزرے تو معلوم ہوا کہ اسی زمانے میں مذکورہ بالا ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کے نصاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا چکا تھا۔ البتہ درجہ ابتدائی کی مدتِ تعلیم تین سال قرار دی گئی تھی اور اس میں صرف ونحو، منطق و فلسفہ کی ابتدائی کتابیں اور عقائد و کلام وفقہ کی مختصر کتابیں داخل کی گئی تھیں۔ [''قواعد و مقاصد''، ص ۲۲]۔ مگر خدا معلوم پھر یہ تقسیم کب اور کیوں ختم کر دی گئی۔

(۶) صرف ونحو اور ادب کے طرز تعلیم کو خاص طور پر بدلنے کی ضرورت ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



صرف ونحو کے ساتھ ادب کی کتابوں کو ملا جلا کر اس طرح پڑھایا جائے کہ طلبہ قواعد کا اجراء کرسکیں اور عربی عبارت صحیح پڑھنے اور صحیح عربی لکھنے اور بولنے پر قادر ہوسکیں۔ فقہ و حدیث میں ائمہ کے اختلافات اور اپنے امام کے مسلک کی وجوہ ترجیح تو ضرور بتائی جائیں مگر اس پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔ اصل کوشش یہ ہو کہ اسلام کی تعلیمات اور احکام کے اسرار و حِکَم ذہن نشیں ہوں اور ان کی صداقت وعظمت کے نقوش لوحِ قلب پر مرتسم ہوں۔ نیز عصرِ حاضر کے نو پیدا مسائل کے حل تلاش کرنے میں بھی طلبہ کی رہنمائی کی جائے۔

(۷) عربی مدارس کے طلبہ میں عموماً یہ کمی پائی جاتی ہے کہ وہ اُردو تحریر پر قادر نہیں ہوتے۔ یہ کمی دُور ہونی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے طلبہ سے دینی و علمی موضوعات پر مضامین لکھوائے جائیں۔ تقریر کی مشق عموماً مدارس میں کرائی جاتی ہے مگر اس کا انداز بھی اب بدلنے کی ضرورت ہے۔ انداز واعظانہ یا مناظرانہ نہیں بلکہ حکیمانہ ہونا چاہیے جس سے متشککین اور منکرین بھی متاثر ہوسکیں۔

(۸) عام مدارسِ دینیہ کے امتحانات کے کم از کم نصف پرچے مرکزی دینی مدارس کے اساتذہ کے مرتب کیے ہوئے ہونے چاہئیں۔ وہی ان کو جانچیں اور طلبہ کی کارکردگی کے متعلق اپنی رپورٹ بھی ارسال فرمائیں۔ تاکہ اس کی روشنی میں طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔

(۹) دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور وغیرہ بڑے تعلیمی اداروں کے اساتذۂ کرام اور علمائے عظام کو چھوٹے مدرسے والے اپنے جلسوں میں بلاتے رہتے ہیں اور اپنے مدرسے کے متعلق ان سے کلماتِ تحسین کے بھی طالب ہوتے ہیں۔ ان بزرگوں کے لیے مناسب ہے کہ ان مدارس کی تعلیمی و انتظامی حیثیت کا بھی جائزہ لیتے رہیں اور جو نقائص معلوم ہوں مناسب طریقے سے ان کو دُور کرانے کی بھی کوشش فرمائیں۔ آخر ان مدارس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ ان کے انسپکٹر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اور ڈائریکٹر تو یہی بزرگ ہو سکتے ہیں۔

(۱۰) مدارسِ عربیہ کو مفید اور بامقصد بنانے کے سلسلے میں سب سے اہم ضرورت قابل اساتذہ کی فراہمی ہے۔ افسوس کہ یہ اساتذہ اب روز بروز کمیاب ہوتے جارہے ہیں۔ دیگر وجوہ کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے عام مدارس میں تنخواہوں کا معیار بہت کم ہے۔ ہر قصبے اور قریے میں عربی مدرسہ اور ہر شہر میں کئی کئی مدرسوں کی ضرورت نہیں مگر جو مدرسہ بھی قائم کیا جائے اس کے اساتذہ کو اتنی تنخواہ ضرور دی جائے کہ وہ اطمینان اور عزت کے ساتھ سادہ زندگی بسر کر سکیں۔ میری رائے میں ان مدارس میں کم از کم دو گریڈ نافذ ہونے چاہئیں... دارالعلوم دیوبند میں ماشاءاللہ اب اس سلسلے میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔

(۱۱) عربی مدارس میں باہم تعلق و ارتباط کی بھی سخت ضرورت ہے۔ اختلافِ مسالک کی وجہ سے یہ تو ممکن نہیں کہ سب کسی ایک نظام کے تحت جمع ہو جائیں۔ مگر یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہر مسلک کے مدارس اپنی اپنی صوبائی یا علاقائی تنظیمیں قائم کرلیں۔ ان تنظیموں کے تحت مدارس کے انتظامی مسائل پر غور کیا جائے۔ طلبہ میں ڈسپلن قائم رکھنے، نصابِ تعلیم میں حالات کے مطابق تبدیلی کرنے، تعلیم کے معیار کو بلند کرنے اور مالی وسائل کو بہتر بنانے کے طریقوں پر تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ نیز یہ بھی طے کیا جائے کہ کوئی طالب علم ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں بغیر ٹرانسفر سارٹیفکٹ کے داخل نہ ہو۔ اس طرح انشاء اللہ تعالیٰ عربی مدارس کی بہت سی خامیاں دُور ہوں گی اور یہ ملّت کی خدمت بہتر طریقے پر انجام دے سکیں گے۔

## اصلاحِ نصاب کی ایک نئی کوشش:

اس موضوع پر بحث تشنہ رہ جائے گی اگر ان مساعی کا ذکر نہ کیا جائے جو محکمۂ اوقاف کی زیرِ نگرانی، حال ہی میں ہندوستان اور پاکستان میں عمل میں لائی گئی ہیں۔ دونوں جگہ کوشش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کی گئی ہے کہ عربی مدارس کو مفید تر اور وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانے کے لیے ایسا نصاب مرتب کیا جائے جس میں مدارسِ عربیہ کے قدیم نصابی مضامین کو جدید تعلیم گاہوں کے رائج الوقت مضامین کے ساتھ سمویا گیا ہو۔ اس وقت مغربی پاکستان (☆) کے محکمۂ اوقاف کا ترتیب دادہ نصاب ''درسِ نظامی'' کے نام سے میرے سامنے ہے جو پانچ سال قبل جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے لیے مرتب کیا گیا تھا اور اس کی ایک کاپی رجسٹرار صاحب امتحانات جامعہ اسلامیہ نے غالبًا بغرض طلب رائے میرے پاس بھی بھیجی تھی۔ اس نصاب کا انداز یہ ہے کہ ایک طالب علم جب ثانوی چہارم کا امتحان پاس کر لے تو اس نے ایک طرف درسِ نظامی کی متوسطات کی تکمیل کر لی ہو اور دوسری طرف وہ تاریخِ اسلام اور فارسی کے علاوہ جدید معاشرتی علوم اور انگریزی سے بھی ہائی اسکول کے معیار کے مطابق بہرہ ور ہو چکا ہو۔

علی ہذا القیاس جب وہ درجۃ الاجازہ (مساوی بی اے) کا آخری امتحان دے تو ایک طرف وہ صحاح ستہ، ہدایہ کامل، بیضاوی شریف، مسلم الثبوت، توضیح تلویح، شرح مواقف، متنبی، حماسہ، سبعہ مُعلّقہ جیسی درسِ نظامی کی انتہائی کتابیں ختم کر چکا ہو، تو دوسری طرف تاریخِ اسلام، تصوف اور کتبِ فارسیہ کے علاوہ، اقتصادیات، فلسفۂ جدیدہ اور بی۔اے تک کی انگریزی زبان کی بھی تحصیل کر چکا ہو۔ اس کے بعد تخصص فی الحدیث والتفسیر، تخصص فی الفقہ و القانون، تخصص فی التاریخ، تخصص فی الدعوۃ والارشاد کے درجات ہیں جو ایم۔اے کے مساوی قرار دیے گئے ہیں۔

اس نصاب کو جن مقدس آرزوں اور مبارک تمناؤں سے مرتب کیا گیا ہے وہ بڑی قابلِ قدر ہیں اور محکمۂ اوقاف کے (سابق) ناظمِ اعلیٰ اور مجلسِ نصاب کے صدر ڈاکٹر شیخ محمد اکرام جو پاکستان کے نامور مصنف بھی ہیں (تھے)، اپنے علمی و دینی جذبات کے لیے قابلِ مبارک باد ہیں۔ مگر ہمیں ان مساعی کے بار آور ہونے میں بڑا شک ہے۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں جب کہ دماغی اور جسمانی صلاحیتیں بھی عام طور

(☆) جب یہ مضمون لکھا گیا اس وقت پاکستان کے دونوں حصے ایک مرکز سے وابستہ تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



پر روبزوال ہیں اور معاشی پریشانیوں نے اطمینان وفراغت کی راہیں بھی روک رکھی ہیں، جملہ علوم قدیمہ وجدیدہ کے دوہرے بوجھ کو کمر پر لاد کر چلنا طلبہ کے لیے عملاً ناممکن کے درجے میں ہے، اس کا نتیجہ طلب الکل فوت الکل کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا۔ سب کو معلوم ہے کہ آج بڑے سے بڑے دارالعلوم کے فضلاء ہوں یا کسی یونی ورسٹی کے گریجویٹ، ان کا علمی معیار افسوسناک درجے تک گر گیا ہے۔ نہ وہ عام طور پر عربی کی ایک سطر صحیح لکھ سکتے ہیں اور نہ یہ ایک معمولی درخواست انگریزی میں۔ جسمانی و دماغی زوال کے اس دور میں یہ توقع رکھنا کہ مجمع البحرین فضلاء پیدا ہوں گے، ایک حسین خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

(۲) یہ تو طلبہ کی بات ہوئی، اس نصابِ تعلیم کے لیے اساتذہ کی فراہمی کا مسئلہ بھی تقریباً لاینحل ہے۔ عربی مدارس کے اربابِ انتظام، جو اپنے مدرسین کو آج بھی (خصوصاً ہندوستان میں) بمشکل سوسوا سو روپے تنخواہ دیتے ہیں، اپنے مدرسوں میں بی۔اے تک کے معیار کی انگریزی اور علومِ جدیدہ کے پڑھانے والے اساتذہ کہاں سے مہیا کریں گے؟ جنھیں بہرحال وہی مشاہرے دینے پڑیں گے جو اسکولوں اور کالجوں میں دیے جارہے ہیں۔

(۳) تیسرا اہم مسئلہ ان مجمع البحرین طلبہ کی کھپت کا ہے۔ ان سب سے یہ توقع رکھنا کہ یہ قوتِ لایموت پر اکتفاء کر کے افریقہ کے میدانوں میں تبلیغِ اسلام کے لیے نکل جائیں گے۔ اخلاص وایثار کے اس دورِ افلاس میں، صحرا میں گل وگلزار کے نمودار ہونے کی توقع سے زیادہ نہیں۔ پاکستان میں تو محکمۂ اوقاف میں کچھ لوگ کھپ بھی جائیں گے۔ یہاں کس محکمہ میں ان کو جگہ ملے گی؟ غالباً یہی عملی مشکلات ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان میں جدید نصاب کے مرتبین، جن میں دو مشہور دینی تعلیمی اداروں کے مہتمم صاحبان بھی شامل ہیں، خود اپنے اداروں میں اس کے جاری کرنے کی جرأت نہیں کر سکے۔

بہرحال مناسب یہی ہے کہ عربی مدارس میں قدیم نصابِ تعلیم کے ساتھ ساتھ علومِ عصریہ کی بقدرِ ضرورت تعلیم ہو جیسا کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اسلامی علوم کو بقدرِ ضرورت سکھایا جاتا ہے۔ یوں کوئی غیر معمولی ذہانت وہمت کا طالب علم دونوں سرچشموں سے سیراب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہونا چاہیے تو اس کے لیے راہِ طلب کھلی ہوئی ہے۔

---

فاضل مقالہ نویس جناب قاضی زین العابدین سجاد نے اپنے ایک دوسرے مقالے میں، جو درسِ نظامی ہی سے متعلق ہے، لکھا تھا: ''اکثر حالات میں نہ طلبہ (عربی مدارس) عربی زبان سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی دینی مسائل سے، نہ قرآن مجید کا ترجمہ کر سکتے ہیں، نہ حدیث کو سمجھتے ہیں، ان کو طویل و عریض سند حوالے کر دی جاتی ہے، جسے وہ بعض حالات میں پڑھ بھی نہیں سکتے۔'' (اسلام اور عصرِ جدید، جنوری ۱۹۷۰ء)

اسی موضوع پر مرحوم مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک مکتوبِ گرامی بنام مرحوم علامہ سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں: ''اس کے سوا اور میں کیا چاہتا ہوں کہ اسلام کے اساسی علوم: قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم لازمی قرار دے کر قدیم علوم کی جگہ جدید علوم وفنون کو قبول کر لیا جائے۔'' (معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۶۳ء)

ابوالکلام آزاد نے سچ کہا تھا: ''زمانہ سے قدامت پسندی ہمیشہ لڑتی رہی ہے۔ قدامت پسندی نے جب ہتھیار اُٹھایا تو کشمکش ضرور ہوئی۔ مگر قدامت پسندی ہاری اور وقت جیتا۔ ہم وقت سے نہیں لڑ سکتے۔''

[ایڈیٹر]

© rasailojaraid.com